اردو کی شعری اصناف

ڈاکٹر خواجہ اکرام

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

Scanned with CamScanner

مرثیہ

رثائی شاعری میں اردو مرثیے کو فنی نقطہ نظر سے ایک خاص عظمت و وقار حاصل ہے کیوں کہ صرف اردو کو یہ فخر و امتیاز حاصل ہے کہ اس نے مرثیے کو ایک منفرد صنف سخن کی حیثیت سے متعارف کرایا، اس کے فنی اور ہیئتی لوازمات کا تعین کیا اور دنیائے شاعری میں رزمیہ نظم نگاری کا بہترین نمونہ پیش کیا۔ اردو کی بیشتر اصناف شاعری فارسی کی مرہون منت ہیں۔ لیکن مرثیہ ایسی صنف ہے جس نے ہندوستان کی سرزمین میں نشو نما پائی اور پروان چڑھی۔ اس کا قطعی یہ مطلب نہیں کہ فارسی اور عربی میں رثائی شاعری موجود نہیں تھی۔ عربی فارسی میں رثائی شاعری کے بہت سے نمونے موجود ہیں لیکن ان کی نوعیت جداگانہ ہے۔ اوّل تو یہ کہ عربی فارسی ادبیات میں رثائی شاعری کے لیے کوئی صنف و ہیئت مقرر نہ تھی۔ رثائی شاعری دراصل انسان کے سب سے بڑے غم اور صدمہ و الم کا بیان ہے اور آپ جانتے ہیں کہ دنیا میں موت سے بڑھ کر اور کوئی غم نہیں اور انسان غم کا اظہار مختلف طریقوں سے کرتا رہا ہے۔ لیکن نفسیاتی نقطہ نظر سے غم کے اظہار کا سب سے مناسب اور عمدہ طریقہ یہ ہے کہ دوسروں کو اس میں شریک کیا جائے کیوں کہ دوسروں کو شریک بنا کر ہی غم کو ہلکا کیا جا سکتا ہے اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مرنے والے کے اوصاف حمیدہ بیان کر کے صبر کی راہ تلاش کی جائے۔ انسانی غم کے اس پہلو کو نظر میں رکھیں اور شاعری کی ان بنیادی خصوصیات پر غور کریں کہ وسائل اظہار میں شاعری ہی سب سے بہتر اور موثر وسیلۂ اظہار ہے۔ انسان کی داخلی کیفیات اور کوائف کو جس دلگیری اور اثر پذیری سے شاعری بیان کر سکتی ہے

Scanned with CamScanner

نثر میں ممکن نہیں۔ ان حقائق کے پیشِ نظر رثائی شاعری کی ابتدائی کڑیوں کی تلاش کی جا سکتی ہے۔ صرف اردو اور عربی و فارسی کی بات نہیں بلکہ عالمی ادبیات میں اس کی تلاش و جستجو کی جائے تو خاطر خواہ نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ شاعری کی ابتدا انسانی جذبات کے اظہار کے طور پر ہوتی ہے۔ لہٰذا ہر ادب کی شاعری میں ایسے سانحے اور موت کے صدمۂ جانکاہ پر شاعروں نے ضرور کچھ نہ کچھ لکھا ہوگا۔ عربی و فارسی شاعری میں رثا کی جو روایتیں موجود ہیں اس کی نوعیت اسی طرح کی ہیں۔ یہاں کسی کی موت پر اظہار رنج و غم سے متعلق اشعار مختلف ہیئتوں میں موجود ہیں اور پوری فنی خصوصیات کے ساتھ۔ مثلاً عربی مراثی اپنے سوز و گداز اور قوتِ تاثیر، جوش و ولولہ کے اعتبار سے بے مثل ہیں۔ فارسی شاعری میں بھی یہ خصوصیت عربی سے ہی آئی ہے۔ البتہ انفرادی سانحے کے ساتھ ساتھ فارسی میں امام حسین اور شہدائے کربلا پر بھی نظمیں لکھی گئی ہیں لیکن مرثیہ (صنفی اعتبار سے) وجود میں نا آسکا۔ اردو میں ابتدائی دور کی شاعری میں جو رثائی نظمیں ملتی ہیں وہ فرد خاص کی موت پر مبنی ہیں۔ لیکن ساتھ ہی امام حسین اور شہدائے کربلا کے موضوعات بھی ہیں اور اس رثائی شاعری نے مرثیے کی شکل اس وقت اختیار کی جب شہدائے کربلا کی یاد کے سلسلے میں مختلف تقریبات کا انعقاد کیا جانے لگا۔ عزاداری اور مجلسوں کا اہتمام اس کا خاص محرک بنا ہے۔ مذہبی نقطۂ نظر سے اہل تشیع شہدائے کربلا کی یاد میں آنسو بہانا کارِ ثواب مانتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ شہدائے کربلا کی یاد میں گرے ہوئے ایک آنسو کے بدلے ایک گناہ دھلتا ہے اور ثواب بھی حاصل ہوتا ہے۔ فضل علی فضلی کی 'کربل کتھا' جو اردو نثر کے ارتقا میں اہم مقام کی حامل ہے کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ فضلی نے وجہ تالیف کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ لوگ محرم کی مجلسوں میں کثیر تعداد میں شریک ہوتے ہیں جن میں 'روضۃ الشہدا' کو پڑھا جاتا ہے۔ مگر ان میں سمجھنے والوں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ بین و بکا میں بخوبی حصہ نہیں لے پاتے جس کے سبب ثواب سے محروم رہتے ہیں۔ اسی لیے میں نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا تاکہ لوگ اسے سمجھ سکیں اور اثر انگیزی کا عمل تیز تر ہو سکے۔ اس

Scanned with CamScanner

سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ مرثیہ کی اصل روح شہدائے کربلا کی یاد میں آنسو بہانا ہے۔ اردو مرثیہ کی ابتدا دکن سے ہوتی ہے اور اس وقت اس کو فروغ ملتا ہے جب محرم کے سلسلے کی تقریبات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ نصیر الدین ہاشمی دکن میں مرثیوں کی ابتدا کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

''سلطان عبداللہ قطب شاہ کے زمانے میں جشن میلاد و مبارک کے جلسوں کے ساتھ ساتھ محرم کی تعزیہ داری میں بھی ترقی ہوئی۔ تمام ممالک محروسہ میں ایام عاشورہ تک نوبت و نقارہ موقوف رہتے۔ گوشت اور پان کی دوکانیں بند ہوجاتیں۔ تمام مسلمان اور ہندو ماتم میں شریک ہوتے تھے۔

''گولکنڈا میں شاہی عاشور خانے تھے۔ جہاں چودہ علم چہاردہ معصوم کے کھڑے کرائے جاتے۔ روشنی کا خاص انتظام ہوتا تھا۔ سوسو دو سو چراغ کا یک برنجی درخت بنایا گیا تھا، جو اپنی روشنی سے عاشور خانہ کو منور کردیتا تھا۔ یہاں مرثیہ گو اور مداحِ شہدا ہر شب کو جمع ہوتے اور اردو میں مراثی اور مناقب پڑھتے تھے۔ جب مراسم تعزیہ داری ادا ہوجاتے تو حکومت کی جانب سے سب کی دعوت ہوتی مگر اس میں بے گوشت کی غذائیں ہوتی تھیں۔ ہر گلی کوچہ میں یہی ہوتا تھا۔ چھٹی تاریخ کو عاشور خانہ کے باہر کے علم اٹھائے جاتے۔ محبان ائمہ اطہار ہاتھوں میں مشعل لیے ہوتے اور ذاکر مداح مرثیہ خوانی اور مداحی اشعار پڑھتے ہوئے ساتھ ہوتے۔ دسویں تاریخ کو خود سلطان عبداللہ سیاہ لباس میں برہنہ پا علموں کے ساتھ ہوتا تھا۔''

(مضمون 'دکن میں مرثیہ کی ابتدا' اردو مرثیہ نگاری، ام ہانی اشرف)

دکنی ادب کے مطالعے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ دکنی شاعروں نے حکمرانوں اور بادشاہوں کے عزاخانوں کے لیے ایسے مرثیے قلمبند کیے جن کے

Scanned with CamScanner

ذریعے محرم کے دنوں میں سوز و گداز کا ایک خاص ماحول بنایا جاتا تھا۔ یہ تقریبات زیادہ مذہبی عقیدت اور اہتمام کے ساتھ بعد میں لکھنو میں منائی جانے لگیں اور لکھنؤ کی ہی سرزمین ہے جس نے اردو مرثیہ جیسی عظیم صنف عطا کی۔ لیکن اس سے پہلے کہ مرثیہ کے دیگر پہلوؤں کا ذکر کیا جائے پہلے اردو مرثیے کی تعریف اور اس کی صنفی نوعیت کو سمجھنا ضروری ہے۔

اردو مرثیہ سے مراد ایسی بیانیہ نظم ہے جس میں شہدائے کربلا ان کے اعزا و اقربا اور کربلا کے سانحے سے متعلق بیانات ہوں۔ اور اسی مفہوم کے پیش نظر اجزائے ترکیبی مرتب کیے گئے جو حسب ذیل ہیں:

(1) چہرہ (2) سراپا (3) رخصت (4) آمد (5) رجز (6) ماجرا (7) جنگ (8) شہادت (9) بین۔

چہرہ دراصل مرثیے کی تمہید ہوتی ہے۔ اس حصے میں زیادہ تر مرثیوں میں صبح کے مناظر ملتے ہیں۔ اس کی توجیہ یہ ہے کہ کربلا میں دسویں محرم کی صبح کو ہی جنگ کی شروعات ہوئی تھی اور قیامت خیز مناظر سامنے آئے تھے۔ اسی مناسبت سے مرثیوں میں صبح کا منظر 'پو پھٹنا' سورج نکلنا، سورج کی لالی اور دیگر متعلقات پیش کیے جاتے ہیں اس کے علاوہ رات کا منظر 'شام کا سماں' بے ثباتی دنیا، اولاد کی محبت، موسم کی شدت اور ریگستانی مناظر بھی نظم کیے گئے ہیں۔ 'سراپا' مرثیہ کا وہ حصہ ہے جس میں شاعر اس شہید کی شوکت و وجاہت رعب و دبدبہ اور اس کی قد و قامت کو بیان کرتا ہے اور 'رخصت' کے تحت جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے حضرت امام حسین کی اجازت کے بعد میدان جنگ میں جانے سے قبل اعزا و اقربا اور اہلِ خیمہ سے رخصت ہونے کا دردناک سماں پیش کیا جاتا ہے اور 'آمد' کے تحت میدان جنگ میں دلیرانہ انداز میں آنے کو بیان کیا جاتا ہے۔ پھر اس کے بعد حسب و نسب اور آباؤ اجداد کے کارہائے نمایاں اور اپنی شجاعت کا بیان رجز کے تحت ہوتا ہے۔ رجز دراصل عربوں کا طریقہ تھا۔ اسی مناسبت سے اسے مرثیے میں شامل کیا گیا۔ 'ماجرا' مرثیے کا وہ حصہ ہے جس

Scanned with CamScanner

میں مرثیہ نگار ہیرو کی جنگ اور شہادت سے قبل ان واقعات کو سرسری طور پر بیان کرتا ہے جن کا تعلق ہیرو سے ہوتا ہے۔ 'جنگ' اس حصہ میں فریقین کو مصروف جنگ و جدال دکھایا جاتا ہے۔ یہاں ہیرو کی شجاعت' فن حرب وضرب میں اس کی مہارت' اس کے دیگر اسباب حرب مثلاً تلوار' نیزہ' سپر اور گھوڑے کی تیزی وطراری کا بیان تفصیل سے ہوتا ہے۔ مرثیے کا یہی عنصر دراصل مرثیے کو رزمیہ نظم کا مقام عطا کرتا ہے اور اس کے بعد شہادت کی منزل آتی ہے جب ہیرو دشمنوں کے نرغے میں ہوتا ہے اور ہر چہار جانب سے اس پر وار ہوتے ہیں اور بالآخر ہیرو جامِ شہادت سے سرشار ہوجاتا ہے۔ اس حصے میں رثا کا پہلو حاوی ہوتا ہے اور اسی جذبے کی شدت 'بین' میں نظر آتی ہے۔ شہادت کے بعد اہلِ خیمہ کی آہ وزاری کا بیان نہایت ہی اثر انگیز اور پُر سوز لہجے میں کیا جاتا ہے۔ تاکہ سامعین پر بھی وہی کیفیت طاری ہوجائے اور وہ بھی غم میں مبتلا ہوکر آنسو بہا سکیں۔

اردو مرثیے کے یہی اجزائے ترکیبی ہیں جن کے سبب اردو مرثیہ منفرد ہوا۔ لیکن یہ بھی واضح رہے کہ تمام مراثی میں اس کی پابندی نہ ہوسکی اور نہ ہوسکے گی۔ کیوں کہ کربلا کے سانحے سے قبل کے واقعات مثلاً امام حسین اور اہل بیت کرام کا مدینے سے نکلنا، راہ کی دشواریاں، حضرت صغریٰ کی بیماری، شہادت کے بعد شام غریباں اور اہل حرم کا قیدی بنایا جانا۔ دمشق کے سفر کی صعوبتیں، یزید کے دربار میں پیشی اور پھر مدینہ کی واپسی، ان تمام واقعات کو بھی مرثیے میں پیش کیا گیا اور ان واقعات کے بیان میں ان اجزائے ترکیبی کو ملحوظ رکھنا ممکن نہ تھا۔ اسی لیے خود انیس و دبیر کے بھی مراثی میں یہ اجزائے ترکیبی پورے طور پر موجود نہیں۔ مگر چوں کہ واقعات کربلا میں سب سے زیادہ زور میدان کربلا کے جنگ کی تفصیلات اور شہادت پر ملتا ہے اس کے مدنظر مرثیے کے اجزائے ترکیبی مرتب کیے گئے جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

اردو مرثیے کی صنفی اور ادبی خصوصیات کے علاوہ اس کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں ہندوستانی عناصر کی بھرپور نمائندگی ہوئی ہے۔ ثقافتی اعتبار سے بھی

Scanned with CamScanner

اس صنف نے اپنے اندر صدیوں کی روایات و اقدار اور رسوم و رواج کو سمیٹ رکھا ہے۔ مثلاً قدیم ہندوستان میں شادی بیاہ کے رسم و رواج، اعلیٰ گھرانوں میں رہن سہن کے آداب و اطوار، طرزِ زندگی وغیرہ اور ادبی اعتبار سے سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ مرثیوں نے ابلاغ و ترسیل کا خوبصورت نمونہ پیش کرتے ہوئے جو ذخیرۂ الفاظ اور اسالیب بیان فراہم کیے ہیں اور ان سے زبان کے قوتِ اظہار میں جو اضافہ ہوا ہے وہ نہایت ہی وقیع اور قابلِ فخر ہیں۔

جہاں تک اردو میں مرثیے کے آغاز و ارتقا کی بات ہے تو اس صنف نے بھی دکن کی سرزمین میں ہی آنکھیں کھولیں۔ اب تک کی تحقیقات کے مطابق دکن کے قدیم ترین مرثیہ نگار شاعر اشرف بیابانی کا ہی نام لیا جاتا ہے۔ 'نوسرہار' اس کے مرثیوں کا مجموعہ ہے جس میں اس نے حضرت امام حسین اور قافلۂ حسینی سے متعلق افراد کے سلسلے میں اپنے تاثر کو پیش کیا ہے۔ اشرف کے مرثیوں کی زبان پر گہری دکنیت غالب ہے۔ ملا وجہی کے یہاں بھی مرثیے ملتے ہیں۔ حالاں کہ وہ دکنی ادب میں اپنی نثر نگاری اور مثنوی نگاری کے سبب مشہور ہیں لیکن انھوں نے پُرسوز مرثیے لکھے ہیں۔ غواصی اور محمد قلی قطب شاہ نے بھی مرثیے کی روایت کو فروغ دینے کی کاوش کی۔ غواصی کے مرثیے زبان و بیان کے اعتبار سے نسبتاً صاف اور سہل ہیں۔ ان کے علاوہ سلطان عبداللہ، قلی قطب شاہ، شاہ لطیف، کاظم، افضل شاہی، ملک خوشنود، سید میران ہاشمی، قطبی، عابد، فائز، محبّ اور متعدد دوسرے شاعروں نے بھی مرثیہ نگاری کی طرف توجہ کی۔ قدیم دکنی شاعروں کی ان منظوم کاوشوں کے تنقیدی مطالعے سے اس کی وضاحت ہوتی ہے کہ دکن میں مرثیہ نگاری کی روایت بھی مقبول تھی۔ لیکن چوں کہ اس وقت تک ایک مخصوص صنفِ سخن کے اعتبار سے مرثیہ گوئی کو اہمیت حاصل نہیں ہوئی تھی اس لیے رثائی شاعری کی طرف توجہ صرف مذہبی عقیدت کی بنا پر تھی اس لیے رثائی شاعری میں بہت زیادہ تنوع اور فنی مہارت نظر نہیں آتی البتہ چند شاعروں نے مثلاً لطیف، شاہی، مرزا اور کاظم نے مرثیہ نگاری میں اپنی انفرادیت قائم کر لی تھی۔ دکن کے

Scanned with CamScanner

دور اوّل میں خاص طور پر شاہی اور مرزا قابل ذکر ہیں جنھوں نے مرثیہ کو بالکل ایک نئی زندگی بخشی۔ مرزا نے مرثیوں میں عنوانات قائم کیے اور طویل مرثیہ لکھنا شروع کیا۔ اس نے حضرت علی اصغر کے حال کا مرثیہ، حضرت قاسم کی شادی، حضرت امام حسین کی پیاس، میدان جنگ کا نقشہ، وغیرہ سب کو الگ الگ نظم کیا ہے۔ ان کی مرثیہ نگاری کے پیش نظر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس وقت تک لوگوں میں مرثیہ کہنے اور لکھنے کا ذوق پیدا ہوگیا تھا اور صرف رونا رلانا مقصد نہ تھا بلکہ واقعات کو مزین کرنا اور اس میں قصہ پن اور تنوع پیدا کرنے کا بھی خیال آگیا تھا۔ ان ابتدائی مرثیوں میں جذبات نگاری اور کردار نگاری کی خصوصیات بھی نظر آتی ہیں۔

دکنی مرثیوں میں ہیئت کی کوئی قید نہیں تھی۔ مرثیے غزل کی صورت میں بھی لکھے جاتے تھے، مثنوی کی صورت میں، مربع کی صورت میں اور مستزاد کی شکل میں بھی اور جیسے جیسے زمانہ بدلتا گیا بیانات میں اور زبان میں صفائی آتی گئی۔ دور مغلیہ تک پہنچتے پہنچتے مرثیوں میں ایک زبردست تبدیلی آئی اور اب مرثیہ، مربع، مخمس اور مسدس ہی میں زیادہ لکھا جانے لگا۔ واقعہ نگاری اور جذبات نگاری بھی تیزی کے ساتھ ہونے لگی۔

شمالی ہندوستان میں مرثیوں کی روایات محمد شاہ کے عہد سے ملتی ہے۔ محمد شاہ کے عہد سے پہلے ہمیں کسی مرثیہ نگار کا نام نہیں معلوم البتہ اس عہد میں تین مرثیہ گویوں کا نام ملتا ہے۔ میاں مسکین اور ان کے دو بھائی حزین و غمگین۔ ان مرثیہ گویوں کا کلام اب نایاب ہے۔ کچھ تذکروں میں اس دور کے دو اور مرثیہ نگاروں کے نام ملتے ہیں ایک پسر لطف علی خاں دوسرا محمد نعیم۔ قائم نے اپنے تذکرہ میں ان کے علاوہ دو اور مرثیہ گویوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک مراد علی قلی ندیم دوسرا میر تقی آخری دو مرثیہ گو سودا کے ہم عصر تھے۔ سودا کے زمانے میں کثرت سے مرثیہ گو موجود تھے۔ جن میں میر امانی اسد، سید محمد تقی، سکندر، میر تقی میر اور گدا خاص ہیں۔ اسی زمانے میں بگڑا شاعر مرثیہ گو محاورہ بنتا ہے۔ جس کے پس پردہ ایک اہم ادبی روایت ہے۔ اس عہد کی سب سے بڑی دین یہ ہے کہ سودا نے مسدس کی ہیئت میں مرثیہ لکھا جو بعد میں میر خلیق اور

Scanned with CamScanner

میر ضمیر کی کوششوں سے مرثیہ کی ہیئت قرار پایا۔

بہر کیف حیات و کائنات کی بدلتی ہوئی شکلوں نے شعر و ادب کے ارتقا کے دھارے کا رخ بھی بارہا موڑا ہے۔ ہر صنف ادب میں وقت کے گذرتے ہوئے کاروان کے نقش قدم ملتے ہیں۔ نیا زمانہ اپنے ساتھ تبدیلیاں لاتا ہے۔ ان کی بدولت ایک صنف ادب پچھلے دور سے یکسر مختلف ہو جاتی ہے۔ چنانچہ لکھنؤ کی سرزمین میں پہنچ کر مرثیہ ترقی کے نہ صرف مدراج طے کرتا ہے بلکہ معراج حاصل کرتا ہے اور جن شعرانے ان مرثیوں کو ایک صنف سخن کی حیثیت سے ایک خاص شکل وصورت عطا کی ان میں میر انیس کے والد میر خلیق اور مرزا دبیر کے استاد میر ضمیر ہیں۔ اردو مرثیے کے ارتقا میں میر ضمیر کو اہم مقام حاصل ہے۔ انھوں نے مرثیہ نگاری کی صنف میں کمال پیدا کیا اور مرثیہ کے لیے ہیئت مقرر کی۔ ''میر ضمیر کے سلسلے میں شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

''سب سے پہلے جس شخص نے مرثیے کو موجودہ طرز کا خلعت پہنایا وہ میر ضمیر، دبیر کے استاد ہیں... انھوں نے مرثیے میں جو جدتیں پیدا کی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

1. رزمیہ لکھا
2. سراپا ایجاد کیا
3. گھوڑے، تلوار اور اسلحہ جنگ کے الگ الگ اوصاف لکھے
4. واقعہ نگاری کی بنیاد ڈالی (شبلی نعمانی۔ موازنۂ انیس و دبیر)

اور خود میر ضمیر کے مرثیے کا یہ بند:

جس سال لکھے وصف یہ ہم شکل نبی کے — سن بارہ سو انچاس تھے ہجر نبوی کے
آگے تو یہ انداز سنے تھے نہ کسی نے — اب سب یہ مقلد ہوئے اس طرز نوی کے
دس میں کہوں سو میں کہوں یہ ورد ہے میرا
اس طرز میں جو جو کہے شاگرد ہے میرا

اور ان کوششوں کو مزید جلا بخشنے والوں میں میر انیس اور مرزا دبیر ہیں۔ آسمان مرثیہ میں ایک چاند ہے تو دوسرا ستارہ۔ انھوں نے اپنے فن کے تمام تر کمالات کا

Scanned with CamScanner

اظہار اسی صنف میں کیا اور مرثیہ کو معراج تک پہنچایا۔ ان کے مراثی میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت رچی بسی ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ انسانی و اخلاقی قدریں، زبان و بیان کی لطافت، طرز بیان کی سحر آفرینی، اظہار و اسلوب کی سحر کاری، واقعہ نگاری اور جذبات نگاری کا کمال اور فصاحت و بلاغت بدرجہ اتم موجود ہے۔ گویا انیس و دبیر نے مرثیہ کی صنف کو اس قدر وسعت اور تنوع بخشا کہ مرثیہ نے دیگر شعری اصناف میں اپنی ایک مخصوص شناخت بنالی۔

اب جدید مرثیے بھی لکھے جارہے ہیں جن میں واقعۂ کربلا کے مقصدی پہلو کا ذکر کیا جارہا ہے۔ یعنی یہ کہ باطل کے سامنے سر کٹا دو لیکن سر کبھی نہ جھکاؤ۔ واقعۂ کربلا کا یہ مقصد علامت کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے جس کے بنیاد گزاروں میں جوش ملیح آبادی اور جمیل مظہری کا نام لیا جاتا ہے۔ مرثیے کا یہ جدید رنگ ذیل کے شعر میں ملاحظہ کیجیے:

یاد رکھنا میں بھی ہوں ابن علیؓ ابن حسینؓ
کربلا کی شان گویا میرے گھر کی شان ہے

Scanned with CamScanner